خودی: جواز و جہات

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

The word "Khudi" the Self is more so ever a synonym to "Ego" in Urdu language. It has been brought into religious and mystic literature in the meaning of arrogance and proud in a negative sense. Furthermore, the connotations of this word in different arts and sciences have never been found analogous or coincidental, whatsoever. Allama Iqbal has himself used this word "Khudi" in an positive manner. He has elucidated the significance of this word in his khutbaat and in the forward of his Poetic work "Asraar-e-Khudi" in a very effective way. The under review research article is written to unfold and clarify the different justifications and coincidental concepts of Iqbal's "Khudi". In this article, an attempt has been made to recognize the objectives and motivations of the concept of "Iqbal's Khudi" in the historic background whereby emphasizing on the circumstances, Iqbal was living. The effort endeavors on the social and political perspectives, which obligated the poet to use this word in that particular sense.

خودی کا لفظ اُردو میں عام طور پر ''انا'' یا Ego کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف علوم وفنون خصوصاً تاریخ، تہذیب اور تصوف میں اور اسی طرح ادب اور شاعری میں لفظ ''خودی'' کو جن مفاہیم میں استعمال کیا گیا ہے، اُن میں کہیں بھی یکسانیت اور ہم آہنگی نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات تو یہ لفظ کسی قدر منفی معنوں اور کبر وغرور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے لفظ ''خودی'' جن معنوں میں استعمال کیا ہے، اس کی بہترین تشریح انھوں نے خود ہی اسرارِ خودی طبع اول کے دیباچے میں کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعیین ذات ہے۔''(۱)

خودی کا تصورفکر اقبال کی بنیاد ہے اور بقول ڈاکٹر محمد رفیع الدین: ''اقبال کے تمام حکیمانہ افکار کا سرچشمہ ہے۔''(۲)

اقبال کی اولین شعری تصنیف اسرارِخودی کا مرکزی موضوع یہی تصورِخودی ہے ۔اس کتاب نے ایک طرف تو اقبال کے افکار کو ہندُستان کے علمی حلقوں میں بحث مباحثے کا موضوع بنایا، دوسری طرف اس کتاب کے (انگریزی ترجمے کے) ذریعے اہل مغرب اقبال کی شخصیت اور فکر سے متعارف ہوئے۔

اسرارِخودی کے بعد بھی اقبال کے اُردو اور فارسی شعری مجموعوں، انگریزی خطبات اور خطوط میں بھی تصورِخودی کی تشریح وتوضیح ملتی ہے۔ یہ اِن کے نظامِ فکر کا مرکز ومحور ہے اور اِن کا نظریۂ حیات بھی ہے اور اسے علامہ اقبال کے جملہ افکار وتصورات کا خلاصہ یا نچوڑ بھی کہا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے ہاں خودی کا تصور ایک خاص پس منظر رکھتا ہے اور اس کا تعلق نہ صرف ہندُستان بلکہ عالم اسلام کے جملہ مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور اخلاقی حالت اور مسلم ممالک کی سیاسی صورت حال سے ہے۔ اقبال کے زمانے میں یونانی فلسفے، افلاطونی تصورات اور وحدت الوجود کے اثرات نے نفی خودی اور ترکِ خودی کو ایک مقبول رجحان بنا دیا تھا۔ ایک طرف تونفس کشی اور قناعت وتوکل کے غلط مفہوم کے نتیجے میں مسلمانوں کے قوائے عمل کمزور ہوتے چلے گئے، دوسری طرف فکری جمود، تقلید وتنگ نظری اور ذہنی پسماندگی نے مسلم معاشروں کی تب وتاب اور توانائی سلب کر لی۔ اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مغربی استعمار رفتہ رفتہ مسلمان ممالک پر قابض ہوتا چلا گیا اور یوں بیشتر اسلامی معاشرے مغرب کے سیاسی غلام بن کر رہ گئے۔ پھر سالہا سال کی سیاسی غلامی نے مسلمانوں کو مغرب کا ذہنی اور تہذیبی غلام بنا دیا۔ علامہ اقبال نے اپنی معروف نظم ''جوابِ شکوہ'' (۱۹۱۱ء) میں مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والی گوناگوں اخلاقی کمزوریوں اور قباحتوں (الحاد، لامذہبیت، فرقہ بندی، قبر پرستی، تن آسانی، بت فروشی) اور بحیثیتِ مجموعی ایک افسوس ناک بےعملی کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم ایک اعتبار سے اُمت مسلمہ کا شہرآشوب ہے۔

اسی زمانے (۱۹۱۱ء) میں علامہ اقبال نے The Muslim Community, A Sociological Study کے عنوان سے اپنا معروف خطبۂ علی گڑھ پیش کیا۔ اس میں بڑے دردمندانہ انداز میں مسلمانوں پر انگریزی تعلیم کے فکری اور تمدنی اثرات کا ذکر کیا گیا ہے، مثلاً وہ مسلم نوجوان کی ذہنی اور تعلیمی حالت پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> He has been allowed, I am afraid, to assimilate western habits of thoughts to an alarming extend...... our youngman who is deplorably ignorant of the life-history of his own community has to go to the great personalities of western history for admiration and guidance. Intellectually he is a slave to the west, and cosequently his soul is lacking in that healthy egoism which comes form a study of one's own history and classics.(4)

اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔۔۔۔اپنی قومی روایات کے پیرائے سے عاری ہوکر اور مغربی لٹریچر کے نشے میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔۔۔عقل و ادراک کے لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔(۴)

فلسفۂ خودی کے پس منظر کے ضمن میں متذکرہ بالا خطبہ اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اقبال نے بطور خاص اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر اور خودداری کا ذکر کیا ہے۔ اس سے متصل زمانے (۱۲-۱۹۱۱ء) میں وہ نوجوانان اسلام کو اپنے ماضی، اپنی تاریخ اور اپنے آبا و اجداد کے مقام و مرتبے کا عرفان حاصل کرنے کا سبق دے رہے تھے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا توجس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا(۵)

اور عین انھی دنوں میں نظم ''شمع اور شاعر'' (۱۹۱۲ء) میں وہ اُمت کو خود شناسی کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو(۶)

اس سے اگلے ہی بند میں وہ انسان کو اس کی اشرف مخلوق کی حیثیت کا احساس دلاتے ہیں:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے(۷)

یہی زمانہ تھا جب انھوں نے اسرارخودی لکھنی شروع کی۔ اس کا زیادہ تر حصہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں لکھا گیا۔ مثنوی کی تکمیل اکتوبر یا نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور پہلی اشاعت ستمبر ۱۹۱۵ء میں عمل میں آئی۔(۸)

مثنوی اسرارخودی شائع ہوئی تو علامہ اقبال کی مخالفت میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ وحدت الوجود، ابن عربی اور حافظ شیرازی پر اقبال کی تنقید بہت سے لوگوں کو ناگوارِ خاطر ہوئی۔ علامہ اقبال کو متعدد مضامین کے ذریعے اپنے موقف کی وضاحت کرنی پڑی۔ پھر مثنوی کے دوسرے اڈیشن میں حافظ سے متعلق بعض اشعار حذف کر دیے، اس پر مخالفت کا طوفان کچھ ٹھنڈا ہوا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، علامہ اقبال نے اپنے پورے ذخیرۂ نظم و نثر کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ خودی کیا ہے؟ اور خودی کا اثبات کیا مفہوم رکھتا ہے؟ انھوں نے واضح کیا کہ ویدانت اور وحدت الوجود کے تصورات نے انسانی وجود کو مشکوک بنا دیا تھا اور انسانی ذات کی نفی اس شد و مد کے ساتھ کی گئی کہ مسلمان عملی اعتبار سے ناکارہ ہوکر رہ گئے۔ عملی صورت حال میں وہ فنا کے راستے پر چل رہے تھے۔ اقبال فنا کی بجائے بقا کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک اپنے وجود کا اعتراف ہی خودی کا اظہار و اثبات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک فطری احساس ہے کہ:

کسے در سینہ می گوید کہ ہستم(۹)

علامہ اقبال کے نزدیک انسانی زندگی اور زندگی کی پوری جدوجہد کا مقصد بلکہ پورے نظام عالم اور کائنات کی غایت خودی کا ظہور ہے۔ کائنات کی ہر شے خصوصاً مخلوق خداوندی اپنی اپنی نوعیت میں، اپنی خودی کا اظہار چاہتی ہے:

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار　　　کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار(۱۰)
پیکرِ ہستی ز آثار خودی است　　　ہر چہ می بینی زِ اسرار خودی است(۱۱)

اقبال کی تلقین ہے کہ ہمیں اپنی خودی کا اعتراف ہی نہیں، اظہار اور اعلان بھی کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں:

وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود　　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا(۱۲)

اقبال واضح کرتے ہیں کہ اسلامی نصب العین نفی خودی نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اس سے اس کا وہ جوہرِ خودی ظاہر ہوگا جو اس کی پہچان اور اس کا تشخص ہے۔ درحقیقت اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسان ایک مستقل ہستی کا مالک ہے اس لیے اس کی صلاحیتوں کی نشو و نما ضروری ہے۔ جب یہ صلاحیتیں نشو و نما پائیں گی تو وہ ارتقا کی منازل طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ جائے گا جو انسانیت کی معراج ہے اور انسانی تصور اس سے زیادہ بڑے مقام کا ادراک نہیں کر سکتا۔

یہ بڑا مقام کیا ہے؟ قدرت نے انسان کو ایک ذمہ دارانہ ہستی کی حیثیت سے دنیا میں بھیجا ہے۔ اسے کچھ فرائض سونپے گئے ہیں اور اس پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ یہی انسان کی عظمت، بڑائی اور بڑا پن ہے اور اپنی اسی حیثیت کا عرفان گویا اپنی خودی کی پہچان ہے۔ انسانی خودی جس قدر مستحکم اور ترقی یافتہ ہوگی، انسان کا مقام اتنا ہی بلند اور برتر ہوگا۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے کیونکہ زمین کی خودی چاند سے زیادہ قوی ہے۔ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے کیونکہ سورج کی خودی مستحکم تر ہے۔ انسان کی خودی ان سب سے مستحکم اور قوی ہے، اس لیے دنیا کی جملہ نباتات، جمادات اور عناصر فطرت انسان کے لیے مسخر کر دیے گئے۔ اب انسان کو اپنی یہ حیثیت برقرار رکھنی ہے اور یہ فنا یا نفی کے ذریعے نہیں، بقا اور اثبات کے ذریعے ممکن ہے۔

جب انسان یا کائنات کی کوئی بھی چیز اپنی خودی کا اظہار کرتی ہے تو گویا وہ خدا کی خدائی پر گواہی دیتی ہے اور اعتراف کرتی ہے کہ ہم ایک برتر ہستی کی تخلیق ہیں مگر ہماری بقا اور حیثیت کو کائنات میں تسلیم کیا گیا ہے:

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی　　　ہر ذرہ شہیدِ کبریائی(۱۳)

اقبال کہتے ہیں کہ کائنات میں گم ہونا، بھٹک جانا یا بے نشاں ہو جانا انسانیت کا مقصود نہیں۔ اس کے برعکس اپنی حیثیت کو ظاہر اور عیاں کرنا مطلوب ہے:

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا(۱۴)

اس طرح جب انسان کے اندر خودی کا احساس پختہ ہوجائے تو پھر خودی خدا کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ یعنی خدا شناسی کے حصول کا ذریعہ بھی خود شناسی ہے ۔خدا تک رسائی صوفیہ اور اولیا کا مقصود رہا ہے۔خودی قُربِ خداوندی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معرفتِ الٰہی کا انحصار خودی کے عرفان اور پھر اُس کے استحکام پر ہے۔جس قدر خودی مضبوط اور قوی ہوگی، رب تک رسائی اور اُس کی پہچان اُسی قدر آسان ہوگی۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال باری تعالیٰ تک رسائی کے لیے خودی کو ایک ناگزیر واسطہ اور وسیلہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اگر خواہی خدا را فاش بینی خودی را فاش تر دیدن بیاموز (۱۵)

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

خودی میں گم ہے خدائی، تلاش کر غافل یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ (۱۶)

گویا خود شناسی اور خدا شناسی لازم و ملزوم ہیں۔اسی حوالے سے خودی کا تعلق توحید سے اُستوار ہوتا ہے۔توحید،خودی کو پختہ اور روشن تر کرتی ہے یعنی باری تعالیٰ سے تعلق قائم ہونے سے انسانی خودی کو جلا ملتی ہے۔علامہ اقبال کہتے ہیں:

خودی روشن ز نورِ کبریائی است (۱۷)

اسی طرح ضربِ کلیم میں کہتے ہیں:

خودی کا سِر نہاں،لا الہ الا اللہ خودی ہے تیغ فساں، لا الٰہ الا اللہ (۱۸)

خودی ایک مسلمان کی اُس فطری خواہش میں معاونت کرتی ہے کہ اُس کی رسائی خدا تک ہو اور اسے قرب خداوندی حاصل ہو۔صوفیہ کا ایک بڑا گروہ وصال باری تعالیٰ کی خواہش رکھتا ہے اور اگر اس خواہش کی تکمیل کی کوئی صورت پیدا ہوجائے تو وہ اپنی ہستی تک کو مٹانے کے لیے تیار اور مستعد نظر آتا ہے مگر حضرتِ علامہ اس کے قائل نہیں کہ قطرہ دریا میں مل کر اپنی انفرادیت سے دستبردار ہوجائے۔علامہ اقبال بھی بلاشبہہ مومن کی روحانی ترقی کے قائل ہیں مگر وہ سمجھتے ہیں کہ انسانی شرف کا تقاضا ہے کہ اُس کی عبدیت قائم رہے۔ معروف انگریزی خطبات میں اُنھوں نے ایک جگہ انسان کی انفرادیت (Indviduality) اور یکتائی (Uniqueness) کا ذکر کیا ہے۔(۱۹) یہ انفرایت کیا ہے؟ انسان خدا کا نائب اور اُس کا خلیفہ ہے۔

گویا کائنات میں وہ مستقل حیثیت اور خاص مرتبہ رکھتا ہے اور اسی لیے اُسے نیابت الٰہی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ وہ امانتِ خلافت کا امین ہے۔جب قرآن حکیم نے فرمایا ہے کہ

اِنَا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَان (سورۃ الاحزاب 72:33)

ترجمہ: ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا۔

بلاشبہہ اُس نے بڑی جرأت و جسارت دکھائی مگر اس جسارت کا اصل سبب اُس کا عرفانِ نفس ہے۔ بالِ جبریل کی نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''(۲۰) میں آدم کو ایک شان کے ساتھ زمین پر اُترتے دکھایا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی نظر میں انسان (عبد) کا مقام کیا ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ نہ صرف روئے زمین پر بلکہ پوری کائنات میں انسان کو تصرف اور اختیار کی قوت عطا کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ اختیارات خودی کی نشوونما اور استحکام سے مشروط ہیں:

دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
تعمیر خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ(۲۱)

گویا انسانیت کا فروغ اور عالمِ انسانیت میں امن، رواداری، انصاف کا نشوونما اُسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنے عبد ہونے کے احساس کو محکم تر کرے۔ اوپر خودی کی یکتا انفرادیت کا ذکر ہوا تھا، یہ انفرادیت اور تشخص عبدیت پر منحصر ہے۔ عبدیت کا مزاج اور اس کا تشخص علامہ اقبال کے نزدیک وصال سے نہیں، فراق سے قائم ہوتا ہے۔ علامہ نے پانچویں خطبے The Spirit of Muslim Culture میں ایک بزرگ عبد القدوس گنگوہی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ معراج النبیؐ کے ضمن میں شیخ موصوف نے فرمایا ''محمد مصطفی ﷺ در قاب قوسین او ادنیٰ رفت و باز گردید۔ واللہ ما باز نگردیم۔''(۲۲)

علامہ اقبال نے اس واقعے سے شعورِ نبوت اور شعورِ ولایت کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ اس کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں: ''اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ ایک شاعر نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے:

موسیٰؑ زِ ہوش رفت بیک پرتوِ صفات تو عین ذات می نگری در تبسمی

یہی اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطۂ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم ہے لیکن تمرد و سرکشی کے لیے نہیں بلکہ خدمت و عبودیت کے لیے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیے، گو یہ فنا فی اللہ کیوں نہ ہو۔''(۲۳)

خودی کے مخصوص مزاج، اُس کے تشخص اور اُس کی یکتا انفرادیت کے علاوہ علامہ اقبال نے خودی کی تشکیل و تعمیر اور استحکام کے لیے چند لوازمات کا ذکر کیا ہے جنھیں ہم عناصرِ خودی بھی کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ اقبال کے ہاں عشق ایک صحت مند، توانا اور تعمیری جذبہ ہے، اس لیے وہ عشق کو خودی کا معاون ہی

نہیں، راہ بر و راہ نما قرار دیتے ہیں۔ اسرارِ خودی کے جس باب میں اس نکتے کی وضاحت کی گئی ہے، اُس کا عنوان ہے: ''در بیاں ایں کہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد'' (۲۴)

جذبۂ عشق خودی کے لیے غیر معمولی قوت و طاقت کا باعث بنتا ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود قوتش فرماندۂ عالم شود (۲۵)

علامہ اقبال عشق کو خودی کے استحکام کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ کئی جگہ انھوں نے عشق اور خودی کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ وہ خودی اور عشق میں بعض مشترکہ صفات اور اقدار دیکھتے ہیں، مثلاً: جرأتِ رندانہ، کشمکشِ حیات، یقین و ایمان، ماورائے زمان و مکاں اور فقر جیسی اقدارِ حیات خودی اور عشق دونوں کا ناگزیر حصہ ہیں۔

۲۔ فقر و غنا بھی خودی کا لازمی ااور ناگزیر حصہ ہے۔ فقر و غنا سے بے نیازی خودی کو مجروح اور کمزور کرتی ہے۔ اسرار و رموز میں ایک عنوان ہے: ''خودی از سوال ضعیف می گردد'' (۲۶)

خود دار انسان ہمیشہ دنیا اور اہلِ دنیا اور مافیہا سے بے نیاز اور مستغنی ہو گا۔ عرفانِ نفس، فقر سے مشروط ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

خودی کے نگہباں کو ہے زیر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فر و فالِ محمود سے درگزر خودی کو نگہ رکھ، ایازی نہ کر (۲۷)

اقبال سمجھتے ہیں کہ فقر و غنا سے دست برداری خودی کی موت کے مترادف ہے۔ ترقی، سربلندی اور عروج، فقر اور خودی کی آمیزش ہی سے ممکن ہے۔ علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ دستِ سوال دراز کرنے سے اجزائے خودی پریشان ہوتے ہیں اور دوسروں کا احسان اُٹھانے سے انسان کی گردن جھکی رہتی ہے۔ خودی فقر کو استحکام بخشتی ہے اس ضمن میں علامہ نے حضرت عمرؓ کے اُس واقعے کا ذکر کیا ہے جو انھیں سفر بیت المقدس کے راستے میں پیش آیا۔ اقبال اُس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ الحذر از منتِ غیر الحذر (۲۸)

اقبال سمجھتے ہیں کہ خودی اور فقر اگر باہم مؤید ہوں تو دو دھاری تلوار بن کر قوت اور طاقت کی ایک علامت یا مثال بن جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ (۲۹)

۳۔ خودی کے لازمی عنصر کے طور پر اقبال نے طاقت اور قوت کو ایک عام قدر کے طور پر پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کا فلسفہ، جدوجہد اور سعی و کاوش کا فلسفہ ہے۔ ان کے نزدیک قوت کا راز سخت کوشی میں پوشیدہ ہے۔ اقبال مردِ کوہستانی اور بندۂ صحرائی کو اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اُن کے شب و روز منزلِ مقصود

کو پا لینے کی جدوجہد میں بسر ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے اسرار خودی میں علامہ نے دو تین حکایات بیان کی ہیں۔ پہلی حکایت پیاس سے بے تاب ایک پرندے کی ہے جس نے ریزۂ الماس کو قطرۂ آب سمجھ کر اُس پر چونچ ماری مگر اپنے مقصد میں ناکام رہا اور پریشان ہوا۔ بعد ازاں اُس نے قطرۂ شبنم سے پیاس بجھائی۔ اس حکایت سے اقبال نے یہ نتیجہ نکالا کہ الماس اس لیے سلامت رہا کہ وہ ٹھوس اور سخت تھا۔ اس کے برعکس شبنم کا قطرہ اپنا وجود کھو بیٹھا کیونکہ وہ سراپا نرم تھا۔ اقبال کہتے ہیں:

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو ریزۂ الماس شو، شبنم مشو

پختہ فطرت صورتِ کہسار باش حاملِ صد ابرِ دریا بار باش(۳۰)

دوسری حکایت الماس و زغال کی ہے۔ کوئلہ (زِغال) الماس سے سوال کرتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ تو بادشاہوں کے تاج کی زینت بنتا ہے اور مجھے خاک میں ملا دیا گیا ہے اور لوگ پاؤں میں روندتے ہیں؟ الماس جواب دیتا ہے کہ میرے بلند مقام اور مرتبے کا سبب میری سختی ہے اور تم اپنی نرمی کے سبب آگ میں جلا کر راکھ بنا دیے جاتے ہو۔ اگر تم پتھر کی طرح سخت ہو جاؤ تو ہر طرح کے رنج و غم، خوف اور خطرات سے نجات پا سکتے ہو۔ ایک دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ حجرِ اسود اپنی سختی اور ٹھوس پن کی وجہ سے کوہِ طور سے بھی زیادہ اونچے مقام و مرتبے کا حامل ہے۔ اقبال اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آبرومندانہ زندگی کا راز سخت کوشی اور سخت گیری میں پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں:

در صلابت آبروئے زندگی است ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است(۳۱)

تیسری حکایت بھیڑ بکریوں اور شیر کی ہے۔ بتاتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں جیسا کہ شیر کی فطرت ہے بھیڑ بکریوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔ بکریاں اور بھیڑیں بتدریج شیروں کا لقمۂ اجل بنتی جا رہی تھیں۔ آخر ایک دانا بکری نے بہت سوچ بچار کرنے کے بعد اس آفت سے نجات کا منصوبہ تیار کیا اور خود کو خدا کا فرستادہ بنا کر شیروں کو سمجھانا شروع کیا۔ اُس نے کہا:

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است زندگی مستحکم از نفی خودی است(۳۲)

اس بکری نے مسلسل یہ تبلیغ جاری رکھی کہ جنت نیک لوگوں کے لیے ہے اور نیک لوگ تارک اللحم ہوتے ہیں۔ گھاس پھونس اور ساگ پات پر گزارا کرتے ہیں۔ دنیائے فانی کی چندروزہ زندگی میں جنگ و جدل یا زور و زبردستی، عقل مندی کی بات نہیں ہے۔ بکری کی تلقین کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیروں نے جدوجہد چھوڑ دی اور اپنی خودی سے غافل ہونے کے نتیجے میں ان کی فطرت بھی بھیڑ بکریوں جیسی ہو گئی۔

۴۔ علامہ اقبال خودی کی بقا اور استحکام کے لیے پیکار یا تصادم اور ٹکراؤ کو لازم خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک قوت، صلابت اور پختگی پیکار ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کا ٹکراؤ

اپنے باطن، خارج اور ماحول سے قدم قدم پر ہوتا ہے۔ یہ آویزش خودی کو مستحکم کرتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ حق اگر حق ہے تو باطل سے اُس کا تصادم لازمی ہے۔ اس تصادم کے نتیجے میں انسان کی عملی صلاحیت بڑھتی ہے اور اُس کی فعالیت اور تحرک میں اضافہ ہوتا ہے ۔ یوں صاحبِ خودی کے سامنے منفی قوتیں مغلوب ہو کر پسپا ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی (۳۳)

بالِ جبریل کی نظم ''ساقی نامہ'' میں خودی کے اس پہلو کے ضمن میں اقبال کہتے ہیں:

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں (۳۴)

یوں خودی کا مزاج ایک ایسی غالب و قاہر قوت کا ہے جو اپنی فعالیت کے سبب، مخالف طاقتوں کو مغلوب کر لیتی ہے۔

۵۔ اقبال کے نزدیک خودی کی نوعیت غیر مادی ہے ۔ وہ مادے سے پیدا نہیں ہوئی البتہ مادے کو تخلیق کرتی ہے۔ وہ ایک لطیف عنصر ہے، اس وجہ سے مادے کو مسخر کر لیتی ہے۔ دراصل خودی کی شناخت اور پہچان کے پیمانے ظاہری اور مادی نہیں۔ ''ساقی نامہ'' ہی میں وہ کہتے ہیں:

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے (۳۵)

۶۔ اپنی فطرت میں غیر مادی ہونے کی وجہ سے خودی زمان و مکاں کی حدود و قیود سے ماورا ہے۔ وہ وقت، قید مقام اور وقت کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل ایک تسلسل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''ساقی نامہ'' (اُردو) میں خودی کے اس پہلو کو اقبال نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے:

فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز
بڑی تیز جولاں، بڑی زود رَس ازل سے ابد تک رمِ یک نفس
زمانہ کہ زنجیر ایام ہے دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے (۳۶)

۷۔ اقبال کے نزدیک خودی کا مزاج ابدیت اور دوام کا ہے۔ وہ غیر فانی ہے اور اسے حیاتِ جاوداں حاصل ہے۔ کسی نوع کی پابندیاں اُس کا راستہ نہیں روک سکتیں، نہ اُسے کوئی دنیاوی یا مادی چیز نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس طرح خودی کی حیثیت لازوال ہے اور وہ موت سے بھی ماورا ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے (۳۷)

۸۔ علامہ اقبال کے نزدیک کائنات اور اس کے اندر جاری پورا نظام عالم خودی کی بنیادوں پر اُستوار ہے۔انسانی زندگی کی جملہ سرگرمیاں، کاوشیں اور جدوجہد خودی کی مرہونِ منت ہیں۔انسانی جدوجہد کسی نہ کسی مقصد یا نصب العین پر مرکوز ہوتی ہے۔اقبال نے بتایا ہے کہ تخلیقِ مقاصد سے خودی کا گہرا تعلق ہے۔اسرارِ خودی کے تیسرے باب کا عنوان ہے: ''در بیاں ایں کہ حیات خودی از تخلیق وتولید مقاصد است''۔ یعنی خودی کی بقا مقصد آفرینی اور اعلیٰ تمناؤں پر منحصر ہے۔کسی بڑے مقصد یا گہری آرزو کے بغیر زندگی میں نہ تو توانائی آتی ہے اور نہ حرارت، درحقیقت کوئی بڑا مقصد یا گہری دلی آرزو ہی زندگی کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔علامہ اقبال کہتے ہیں:

زندگانی را بقا از مدعاست کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل اُو در آرزو پوشیدہ است(۳۸)
ما زِ تخلیق مقاصد زندہ ایم از شعاع آرزو تابندہ ایم(۳۹)

خودی اور تخلیق مقاصد کا باہمی تعلق قائم کر کے درحقیقت اقبال یہ کہنا چاہتا ہیں کہ ایک بلند نصب العین یا اعلیٰ درجے کا روحانی مقصد ہی بقائے حیات کا ضامن ہے۔کسی چیز کی لگن ہی ہمیں زندہ رہنے پر اُکساتی یا مجبور کرتی ہے اور اس طرح ہم گرد و پیش کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔

۹۔ اپنی ابدیت اور حیاتِ جاودانی کے سبب خودی تقدیر پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی جس قدر مستحکم ہوگی، وہ تقدیر کو مغلوب کرے گی۔ اپنی اسی قوت کی بنا پر خودی کائنات کی تہذیب بھی کرتی ہے اور اُس کی تسخیر بھی۔

خودی کی گونا گوں صفات، اُس کے لوازمات اور اُس کے مختلف عناصر کا ذکر کرتے ہوئے مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ کے نزدیک معیارِ زیست خودی ہی ہے۔خیر وشر کے پیمانوں کا تعین بھی خودی سے ہوتا ہے۔ جو چیز یا جو رویہ یا طرزِ عمل یا راستہ خودی کو استحکام عطا کرے اور اس کی نشوونما میں معاونت کرے، وہ اقبال کے نزدیک پسندیدہ اور محمود ہے۔اس کے برعکس جو راستہ نفی خودی کی طرف جاتا ہے، وہ قابلِ مذمت ہے۔

آخر میں یہ بتانا بھی مناسب ہوگا۔علامہ اقبال نے خودی کی تربیت اور نشوونما کے لیے تین مرحلوں کی نشان دہی کی ہے:

۱۔ اطاعت: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ایک بندے اور غلام کی حیثیت سے اپنے رب کو اپنا آقا اور مالک تسلیم کرے۔اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔اگر وہ یہ رویہ اپناتا ہے تو پوری کائنات اس کی مسخر و مطیع بن جاتی ہے۔علامہ نے اس ضمن میں اونٹ کی مثال دی ہے جو خدمت و محنت اور صبر و استقلال کے راستے پر گامزن رہتا ہے اور بلاشکوہ و شکایت نہایت خاموشی کے ساتھ اطاعت کوشی کی ایک مثال بن

جاتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ انسان کو بھی اسی طرح اطاعت الٰہی کا پابند ہونا چاہیے کیونکہ اطاعت ہی سے انسان، انسان بنتا ہے:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار(۴۰)

بعد ازاں اقبال نے مختلف مثالوں کے ذریعے اور دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ شریعت کی پابندیاں ہی انسانی زندگی کے حسن وتوازن کی ضمانت ہیں۔

۲۔ ضبطِ نفس: اطاعت الٰہی کا منطقی نتیجہ ضبطِ نفس کی صفت ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ زندگی میں جملہ خرابیوں کی بنیادی وجہ نفس کی غلامی ہے۔ نفس قابو میں نہ ہوتو انسان خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں مال، دولت، وطن، زن اور اولاد وغیرہ سے محبت کا جذبہ ودیعت کیا ہے۔ انسان ان محبتوں میں اعتدال کی راہ چھوڑ کر بھٹک جاتا ہے۔ ضبطِ نفس ہی انسان کو راہِ راست پر رکھتا ہے اور اس کے لیے اقبال نے ارکانِ اسلام (نماز، روزہ، حج، اور زکوۃ) کی پابندی کو بطور دوا تجویز کیا ہے۔ یہ ارکان نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ اجتماعی خودی کی نشوونما کا بھی مؤثر علاج ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ارکان اسلام باری تعالیٰ سے انسان کے رابطے کا ذریعہ ہیں اور تن پروری، غیر اللہ کے خوف اور معاشی ناہمواری کو دور کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ خدا خوفی، قربانی، مساوات اور اتحادِ اُمت کا درس دیتے ہیں۔

۳۔ نیابتِ الٰہی: اطاعتِ الٰہی اور ضبطِ نفس کی صفات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان رفتہ رفتہ نیابت الٰہی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے جو خودی کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ درحقیقت یہی انسانی تخلیق کا مقصد بھی ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ متذکرہ بالا تین صفات انسان کو خدا کے نائب کی حیثیت سے کائنات پر تصرف اور اقتدار عطا کرتی ہیں:

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر حکمراں بودن خوش است(۴۱)

یوں انسان ایک نئے دور کا نقیب بن کر دنیا کے سامنے آتا ہے۔ وہ علم، قوت، اور طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ نائب حق قوموں کو غلامی سے نجات دلانے کا تاریخی کا رنامہ سرانجام دیتا ہے۔ وہ انسانیت کے لیے نذیر بھی ہے اور بشیر بھی۔ وہ زندگی کی نئی تعبیریں کرتا ہے۔ صحیح معنوں میں وہ مردِ کامل اور مردِ مومن کا کردار ادا کرتا ہے۔ علامہ اقبال اُس نائب حق یا مردِ کامل کے ظہور کے لیے دست بدعا ہیں:

اے سوارِ اَشہبِ دوراں بیا اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا(۴۲)

وہ سمجھتے ہیں کہ ملت اسلامیہ خوار وزبوں ہے، زوال وانحطاط کی اسیر ہے اور اسے اس پریشاں حالی سے کوئی نائبِ حق یا مردِ کامل ہی نجات دلا سکتا ہے۔

اقبال کے تصورِ خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس ضمن میں ان پر بہت سے اعتراضات بھی کیے

گئے ہیں۔ اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو بعض یورپی ناقدین نے یہ قیاس آرائی کی کہ اقبال نے جرمن مفکر نطشے کے افکار کی وضاحت کی ہے۔

دراصل دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر بھی قطعی طور پر طبع زاد (Original) نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتا یا لکھتا ہے اس کے پس منظر میں اس کا ماحول، مطالعہ، اس کا علم اور بہت سے دوسرے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی کے مآخذ کیا ہیں؟ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودی (بلکہ اقبال کے دیگر تمام افکار) کا ماخذ اوّلاً قرآن حکیم ہے۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی قرآن حکیم ہی کا فلسفہ ہے۔ اسی طرح ابدیت، خدا شناسی، فقر، جذبۂ عشق، قوت و طاقت اور خود داری وغیرہ بھی وہ اخلاقی صفات ہیں جن پر قرآن حکیم بار بار زور دیتا ہے۔ قرآن حکیم کے افکار کا مرکزی نکتہ توحید ہے اور اس بارے میں علامہ اقبال نے نہایت واشگاف انداز میں کہہ دیا:

خودی کا سرِ نہاں، لا الٰہ الا اللہ[۴۳]

مولانا عبد السلام ندوی کے بقول ''فلسفہ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔''[۴۴]

خودی کا دوسرا ماخذ نبی کریمؐ کی سیرت ہے۔ آپؐ کی ذات گرامی کے اندر خودی کا بہترین اور سب سے زیادہ نشو و نما یافتہ نمونہ موجود تھا۔ خودی کے جن عناصر اور لوازم کا گذشتہ سطور میں ہم نے ذکر کیا ہے (عشق، فقر، خدا شناسی، طاقت وغیرہ) یہ سب اوصاف آپؐ کی ذات گرامی میں بدرجۂ اکمل موجود تھے۔

اسی طرح فلسفۂ خودی کی تشکیل کے ضمن میں علامہ اقبال نے ایک حد تک مولانا جلال الدین رومی سے بھی کچھ نہ کچھ اثرات قبول کیے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی تو وہ رومی کو اپنا مرشد مانتے ہیں اور اسرارِ خودی کے آغاز میں لکھتے ہیں:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد[۴۵]

اردو کلام میں تو وہ خودی اور رومی کے درمیان ایک گہرا رابطہ قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک　　کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک[۴۶]

اسی طرح خودی کے سلسلے میں علامہ اقبال نے مشرق و مغرب کے مختلف علما، حکما اور صوفیہ سے کچھ نہ کچھ تأثر ضرور قبول کیا ہے اور یہ ناگزیر تھا کیونکہ اقبال ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انھوں نے علوم شرقیہ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اہل مغرب کے بہت سے مفکرین کو بھی پڑھا تھا اور سبھی سے مثبت، تعمیری اور حکمت کی باتیں اخذ کی تھیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکرِ انسانی میں، اسی طرح شاعری اور تصوف میں بھی خودی کا تصور کسی نہ کسی انداز اور کسی نہ کسی سطح پر ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اقبال کو ہم کسی کا نقال یا مُقلد

نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنی نوعیت میں فلسفۂ خودی کو ایک خاص مفہوم اور انداز و صورت میں پیش کرنے والے پہلے مفکر اور شاعر ہیں۔

اوپر کی سطور میں اقبال کے تصورِ خودی کے اہم نکات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خودی ایک ایسا وسیع اور بڑا موضوع ہے جس کی وضاحت چند صفحوں میں نہیں سما سکتی۔ علامہ اقبال کے بقول:

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں   تو آب جُو اسے سمجھا اگر تو چارا نہیں (۴۷)

حوالہ جات و حواشی

۱- محمد اقبال، علامہ، اسرارِ خودی، یونین سٹیم پریس لاہور، طبع اول [۱۹۱۵ء] ص ''ل''
۲- ڈاکٹر محمد رفیع الدین، حکمتِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد ۱۹۹۶ء، ص ۱
۳- لطیف احمد شروانی (مرتب)، *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۰۔۱۳۱
۴- سید عبدالواحد معینی+محمد عبداللہ قریشی (مرتبین): ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر''، مشمولہ: مقالاتِ اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲-۱۷۳
۵- اقبال، علامہ، بانگِ درا، مشمولہ: کلیاتِ اقبال اردو۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۸۰
۶- ایضاً، ص ۱۹۲
۷- ایضاً، ص ۱۹۳
۸- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۱
۹- محمد اقبال، علامہ، پیام مشرق، مشمولہ: کلیاتِ اقبال فارسی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۱۳
۱۰- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۱۲۹
۱۱- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص ۱۲
۱۲- محمد اقبال، علامہ، ضرب کلیم، ص ۳۴
۱۳- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۵۳
۱۴- محمد اقبال، علامہ، بانگِ درا، ص ۲۷۳
۱۵- محمد اقبال، علامہ، ارمغانِ حجاز فارسی، ص ۱۰۹
۱۶- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۴۶
۱۷- محمد اقبال، علامہ، ارمغانِ حجاز فارسی، ص ۱۲۱
۱۸- محمد اقبال، علامہ، ضربِ کلیم، ص ۱۵
۱۹- محمد اقبال، علامہ، *The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam*، مرتب: محمد سعید شیخ، اقبال

اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۷
۲۰- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۱۴۲
۲۱- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۱۳۲ - ۱۳۳
۲۲- لطائف القدوسی بحوالہ: *Reconstruction*، ص ۱۷۹
۲۳- محمد رفیق افضل (مرتب)، گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۵، تقریر ۱۹۲۷ء
۲۴- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص ۱۸
۲۵- ایضاً، ص ۱۲۵
۲۶- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص ۲۴
۲۷- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۱۲۸
۲۸- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص ۲۳
۲۹- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۷۷
۳۰- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص ۵۵
۳۱- ایضاً، ص ۵۷
۳۲- ایضاً، ص ۳۵
۳۳- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۱۰۵
۳۴- ایضاً، ص ۱۲۶
۳۵- ایضاً، ص ۱۲۸
۳۶- ایضاً، ص ۱۲۶ - ۱۲۷
۳۷- محمد اقبال، علامہ، ضربِ کلیم، ص ۳۱
۳۸- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص ۱۵
۳۹- ایضاً، ص ۱۷
۴۰- ایضاً، ص ۴۱
۴۱- ایضاً، ص ۴۴
۴۲- ایضاً، ص ۴۶
۴۳- محمد اقبال، علامہ، ضربِ کلیم، ص ۱۵
۴۴- ندوی، عبدالسلام، مولانا، اقبال کامل، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۳۱۶
۴۵- محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز فارسی، ص ۹
۴۶- محمد اقبال، علامہ، ضربِ کلیم، ص ۱۲۱
۴۷- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، ص ۴۴